مسلم اُمہ، عالمی منظر اور داخلی تضادات

ڈاکٹر محمد مختار شنقیطی ○

اس بات پر مجھے بہت خوشی ہے کہ جماعتِ اسلامی سے وابستہ اپنے بھائیوں اور بہنوں سے ملاقات کا موقع مل رہا ہے۔ میرے لیے علّامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے شہر لاہور میں آنا بھی بے پناہ خوشی کا باعث ہے، کیونکہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھیں علّامہ اقبال کے سیکڑوں اشعار کا عربی ترجمہ زبانی یاد ہے۔ اسی دوران مجھے مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے مرقد پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، جن سے مجھے بے حد محبت ہے اور میں نے ان کی کتب اور ملفوظات سے بہت فیض حاصل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سیّدی مودودی کی قبر پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، آمین!

مَیں چونکہ بین الاقوامی تعلقات کی کلاسیں پڑھاتا ہوں، لہٰذا ذرا گہرائی میں جا کر موجودہ عالمی سیاسی منظرنامہ کے اندر اُمتِ مسلمہ کی صورت حال پر عمومی بات کروں گا۔ دورِ حاضر میں ہم دُنیا میں زمینی سطح پر اور سمندروں میں بڑی طاقت ور عالمی قوتوں کے درمیان ایک تاریخی کش مکش کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ موجودہ عالمی سیاست میں بڑی طاقتوں سے مراد چین، روس اور ہندستان جیسے مشرقی ممالک ہیں، جب کہ بحری طاقتوں سے مراد امریکا اور یورپ ہیں۔

عالمی منظرنامہ

گذشتہ چند عشروں میں کارفرما یک قطبی (Uni-polar) عالمی سیاست میں بین الاقوامی نظام کی باگ ڈور بلاشرکت غیرے امریکا کے ہاتھ میں رہی ہے۔ اب ہم بین الاقوامی نظام میں ایک نئی ٹوٹ پھوٹ کا مشاہدہ کر رہے ہیں، اور عالمی طاقت مغرب سے مشرق کی طرف بالخصوص چین کی طرف منتقل

○ پروفیسر شعبہ بین الاقوامی تعلقات، قطر یونی ورسٹی اور معروف محقق (منصورہ میں استقبالیہ سے خطاب)۔ ترجمہ: حافظ اسامہ عبدالحمید، اسلام آباد

ہو رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تزویراتی مفکرین کی اکثریت آج چین کی اُبھرتی ہوئی طاقت کے ظہور کی بات کر رہی ہے۔ 'چین کا طلوع' (Rise of China) ایک ایسی اصطلاح ہے، جس کی تکرار مغربی مفکرین، روزانہ کی بنیاد پر کر رہے ہیں۔ اسی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم اپنے سامنے عالمی میدان میں ایک مسابقت اور ایک کش مکش کو پروان چڑھتا دیکھ رہے ہیں، جسے سرد جنگ (Cold War) کی نئی شکل بھی کہا جا سکتا ہے، اور اسے پہلے سے قائم سپر پاورز اور 'نئی اُبھرتی سپر پاورز' (Emerging Powers) کے درمیان ہمیشہ رہنے والے ٹکراؤ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

آج ایک طرف چین اور روس کی ابھرتی طاقتیں ہیں اور دوسری طرف امریکا و یورپ روایتی سپر پاورز کے درمیان ٹکراؤ چل رہا ہے۔ اس ٹکراؤ اور کش مکش کو سمجھنا اور اس کا ادراک کرنا مسلم دُنیا کے ایک ایک فرد کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ ہم وہ لوگ ہیں جو ان دونوں بڑی طاقتوں اور بحری قوتوں کے درمیان پس رہے ہیں، موجودہ سپر پاورز اور نئی اُبھرتی ہوئی پاورز کے درمیان پس رہے ہیں۔

ہم اُمتِ وسط ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے محلِ وقوع اور جغرافیہ کے لحاظ سے بھی اُمتِ وسط ہیں، اور اس لحاظ سے بھی کہ ہم نہ مشرقی بلاک کا حصّہ ہیں اور نہ مغربی بلاک کا۔ لا شرقية لا غربية، إسلامية إسلامية کا نعرہ میرے خیال میں اُمتِ مسلمہ کی سیاسی و جغرافیائی پوزیشن کا درست اظہار ہے۔ اُمتِ مسلمہ نہ شرقی ہے اور نہ غربی، بلکہ یہ اُمتِ وسط ہے۔ یہ نہ محض خشکی پر ہے اور نہ صرف بحر پر متمکن بلکہ یہ بحر و بر کی طاقت کا ایک امتزاج ہے۔

اللہ عزّ وجل کی حکمت کا کس قدر خوب صورت مظاہرہ ہے، جو اللہ نے اپنا پیغام انسانیت تک پہنچاتے ہوئے دنیا کو دکھایا۔ آپ دیکھیے کہ اسلام کا ظہور مکہ میں ہوا، جو ہے تو ایشیا کے شمال میں، مگر ایک جانب وہ برِاعظم افریقہ سے بہت قریب ہے اور دوسری جانب یورپ سے بھی اس کا فاصلہ انتہائی کم ہے۔ گویا اسلام کا سوتا جہاں پھوٹا وہ سرزمین تین بڑے براعظموں کے سنگم پر واقع ہے۔ اور پھر اسلام جزیرہ نما عرب سے، پَر پھیلائے ایک ایسے بڑے پرندے کی مانند پھیلتا چلا گیا، جس کا ایک پَر ایشیا کے جنوب میں تھا تو دوسرا افریقہ کے شمال پر محیط۔ آپ جانتے ہیں کہ اقبال نے اپنی شاعری میں مسلمانوں کے لیے عام طور پر 'شاہین' کی تمثیل استعمال کی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے

کہ مسلم دنیا کی جغرافیائی ہیئت ایک عظیم الجثہ 'شاہین' کی مانند ہے، جس کا دل مکہ و مدینہ ہے اور اس کے پَر ایشیا کا جنوب اور افریقہ کا شمال ہیں۔ یہی وہ جیو پولیٹیکل تناظر ہے، جو طاقت کی بحری و برّی طاقتوں اور حالیہ سپر پاورز اور اُبھرتی ہوئی نئی سپر پاورز کے درمیان درپیش رہا ہے۔

چین کی اُبھرتی طاقت جسے شکاگو یونی ورسٹی کے پروفیسر جان میرشیمر (Mearsheimer) کی اصطلاح میں 'زور پکڑتا طوفان' (The Chinese Gathering Storm) کہا جاسکتا ہے۔ گویا چین ایک ایسا طوفان ہے جو تمام عالم کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے قوت پکڑ رہا ہے۔ اسی دوران ہم، بے سمتی کے کچھ برسوں کے بعد روس کو بھی ایک نئی کروٹ لیتا دیکھ رہے ہیں۔ بے سمتی کا یہ عرصہ گورباچوف اور بورس یلسن کے اقتدار پر محیط رہا، جس کے بعد ولادی میر پیوٹن ایک زخمی بھیڑیئے کی روح سمائے روس کا مطلق العنان حکمران بن گیا۔ پیوٹن روس کو عظیم بنانا چاہتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ڈونلڈ ٹرمپ کا نعرہ امریکا کو دوبارہ عظیم تر بنانے کا تھا۔

طاقت کا تیسرا مشرقی کھلاڑی ہے ہندستان۔ یہ عالمی سیاست کا ایک نہایت گنجلک کیس ہے۔ یہ بحری و برّی دونوں طرح کی طاقت رکھنے کے باوجود کئی تضادات کا شکار ہے۔ تاریخی طور پر ہندستان دنیا کی ایک عظیم مسلم سلطنت مغل بادشاہت کی سرزمین رہا ہے، تاہم آج یہ مسلم اکثریتی ملک بھی نہیں ہے۔ انڈونیشیا اور پاکستان کے بعد تیسری بڑی مسلم آبادی رکھتا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ مسلم ملک نہیں ہے۔ ہندستان مسلم جغرافیہ کے بیچوں بیچ واقع ہے کہ یہ مشرقِ وسطیٰ اور مغربی ایشیا کے مسلمانوں کو جنوب مشرقی ایشیا کے مسلمانوں سے جدا کر رہا ہے۔ مزید یہ کہ ہندستان اپنے جغرافیہ اور اپنی آرزوؤں کے درمیان بٹا ہوا ہے۔ جغرافیائی طور پر مشرق میں واقع ہے، لیکن اس کی اُمنگوں کی منزل مغرب ہے۔ گویا گھر تو اس کا ایشیا ہے، مگر دل یورپ میں ہے۔ یقیناً مسلم دُنیا کے لیے ہندستان بہ حیثیت ایک نسل پرست ہندو ریاست کے، ایک بڑا چیلنج ہے۔ پاکستان کے لیے تو یہ ہمیشہ ہی سے ایک مسئلہ رہا ہے، مگر جب سے مودی اقتدار میں ہے، آج کا ہندستان اپنے ملک میں سیکڑوں برسوں سے آباد مقامی ہندستانی مسلمانوں کے لیے بھی ایک بڑا چیلنج بن چکا ہے۔ فاشزم کے راج اور فاشزم کے خواب نے اسے بڑی خطرناک صورت حال میں لاکھڑا کیا ہے۔

سرد جنگ اور حریفانہ کشاکش کے اس منظرنامہ میں عالم اسلام کی حیثیت، جنگ کے ایک

میدان کی سی ہے ۔ برطانوی ماہر سیاسیات جیمز فیرگریو نے 'تباہی کا علاقہ' (Crash Zone) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ہم اس کشاکش میں بطور فریق شریک نہیں ہیں بلکہ اس حریفانہ کش مکش کا شکار ہیں۔ گویا عالمِ اسلام طاقت کے اس کھیل میں بطور 'جنگی اکھاڑہ' (Battle field) کے استعمال تو ہو رہا ہے، لیکن بطور کھلاڑی شریک نہیں ہے۔ یہ مسئلہ آج کا نہیں ہے بلکہ جب سے مسلم اُمہ، دو عظیم طاقتوں (یعنی) مغلیہ سلطنت اور عثمانی خلافت سے محروم ہوئی ہے، عالم اسلام کی حیثیت اوروں کے لیے ایک میدانِ جنگ ہی کی بن کر رہ گئی ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ مسلمان آج عالمی نظام کا فعال حصّہ نہیں رہے۔ اُمت اس وقت اندرونی خلفشار کا شکار ہے اور اور بیرونی طاقتوں کے سامنے بے آسرا۔ ایک ایسی امت کا یہ حال بہت افسوس ناک ہے کہ جس نے انسانیت کی رہنمائی اور قیادت کرنی تھی ، اور جسے شھداء علی الناس بننا تھا۔ تزویراتی طور پر جب آپ بے آسرا، دفاعی حوالے سے کمزور، اور معاشی و سیاسی انتشار کا شکار ہوں تو کبھی بھی شھداء علی الناس نہیں بن سکتے۔ جب آپ عالمی اتار چڑھاؤ میں کوئی وزن ہی نہیں رکھتے، پوری انسانیت کے لیے حجت اور شہادت کیوں کر بن سکتے ہیں؟

مسلم دُنیا میں علاقائی وحدت کی ضرورت

بطور امت ہمیں آج جن خوفناک چیلنجوں کا سامنا ہے، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ایمان اور اتحاد کی قوت درکار ہے۔ مسلمانوں کے درمیان وحدت اور اتحاد، وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور ہمیں اس وحدت کے قیام کی کوشش کرنی ہے۔ وحدت سے میری مراد ایک عالم گیر خلافت کے تحت قائم سیاسی وحدت نہیں ہے، بلکہ میری مراد مسلم دنیا کے مابین اسٹرے ٹیجک ارادے اور عزم (Will) کی وحدت ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مغربی دنیا سیاسی طور پر ایک نہیں ہے۔ ۲۴ سرکاری زبانوں اور بہت سی نسلی اکائیوں کے حامل ۲۸ ممالک 'یورپی یونین' (EU) کہلاتے ہیں۔ یورپ کے باسیوں کے درمیان قدرِ مشترک یا تو ان کا مسیحی پس منظر ہے، یا ان کا یونانی و رومی ورثہ مشترک ہے، جس کی بنیاد پر یہ ممالک اپنا اسٹرے ٹیجک ارادہ ایک بنانے میں کامیاب ہوئے۔ فرانس اور جرمنی، پولینڈ اور برطانیہ اور دیگر یورپی قوموں کا اتحاد ان مشترکات پر قائم ہے۔ حالانکہ ان قوموں کے درمیان بڑی خوں ریز جنگوں کی ایک طویل تاریخ، یہاں کے لوگوں کو ازبر بھی ہے۔ ان کے مقابلے میں

ہم مسلمانوں کے درمیان اس سے کہیں زیادہ مماثلتیں اور مشترکات موجود ہیں۔ طویل یکساں تاریخ، مشترک عقیدہ، ایک ہی قبلہ اور ایک ہی کتاب ہماری بڑی طاقت ہیں۔

مسلم دنیا جغرافیائی لحاظ سے بھی مغرب سے کہیں زیادہ باہم مربوط ہے۔ بطور مثال اگر ہم آسٹریلیا کو دیکھیں، آسٹریلیا اور برطانیہ کا درمیانی فاصلہ کتنا زیادہ ہے؟ لگ بھگ ۱۵ ہزار کلومیٹر۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ، امریکا سے کس قدر فاصلہ پر ہیں؟ وہی ۱۵ ہزار کلومیٹر کی مسافت پر۔ مسلم دنیا میں ہمیں باہم اس قدر فاصلہ کہیں نہیں ملتا۔ مثال کے طور پر مسلم دنیا کے قلب (خطۂ حجاز) سے بعید ترین ملک کا فاصلہ، مثلاً یمن کا انڈونیشیا سے فاصلہ اگر لیں تو ۵ ہزار کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہوگا۔

گویا مسلم دنیا میں اسٹرے ٹیجک اتحاد و یگانگت کی صلاحیت اور امکان کہیں زیادہ ہے۔ اگر یہ اتحاد بروئے کار آجائے تو عالمی منظرنامے پر اس کی موجودگی اور اس کا اثر بہت گہرا ہوگا۔ مسلم دنیا کے روایتی حدود کو بتانے کے لیے مسلم جغرافیہ دان ایک اصطلاح استعمال کرتے آئے ہیں من فرغانا إلیٰ غانا (فرغانہ سے گھانا تک)۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں فرغانہ، ازبکستان میں ہے، اور گھانا مغربی افریقہ میں۔ اور آج بھی عالم اسلام کی حد بندی یہی ہے۔ اس دور کے عظیم الجزائری مفکر مالک بن نبی نے مسلم دنیا کی حدود بتانے کے لیے من طنجا إلیٰ جاکرتا (طنجا سے جکارتا تک) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ مراکش کے شہر طنجا سے لے کر انڈونیشیا کے دارالحکومت جکارتہ تک مسلم دنیا کے حدود ہیں۔ یہ کم وبیش وہی جغرافیہ ہے جس کا احاطہ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں کیا تھا۔ ابن بطوطہ چودھویں صدی کے سیاح تھے۔ انھوں نے اپنے سفر کا آغاز طنجا سے کیا، اور بہت سے مسلم ممالک، اور اس وقت کی اصطلاح میں بلاد الھند والسند یعنی برصغیر ہند و پاک میں بھی آئے۔ وہ آٹھ برس تک ہندستان میں قیام پذیر رہے اور نہ صرف یہاں قاضی کے فرائض انجام دیئے بلکہ ہندستانی فرماں روا کے سفیر بن کر چینی بادشاہ کے ہاں بھی گئے۔ اس طرح انھوں نے مغربی افریقہ سے جنوبی ایشیا، جنوب مشرقی ایشیا تک تمام مسلم دنیا میں سفر بھی کیا اور قیام بھی۔ لہٰذا، ہمیں مسلم دنیا کے اسی تاریخی اسٹرے ٹیجک اتحاد کی بازیافت کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔

ہمیں مسلمانوں کے اسٹرے ٹیجک ارادے اور خواب کو ایک کرنے کی ضرورت ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم ایک سیاسی اکائی بن جائیں۔ ہمیں مسلم ممالک کے درمیان اپنی باہمی سرحدیں

کھولنے کی ضرورت ہے۔ مسلم ممالک کے درمیان باہمی طور پر معاشی تعاون کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ ہمیں عالم اسلام میں فوجی اتحادوں کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں، ویسا ہی دفاعی معاہدہ جیسا کہ مغرب میں 'ناٹو' ہے۔ ہمیں ایسی چیز کی ضرورت ہے، جسے اقبال نے 'اسلامی دولت مشترکہ' کہا تھا۔ انھوں نے 'مسلم کامن ویلتھ' کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے اور 'مسلم لیگ آف نیشنز' کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ دوسرے اسلامی محققین نے بھی اس کے بارے میں بات کی ہے۔ جیسا کہ مالک بن نبی نے اپنی کتاب اسلامک کامن ویلتھ میں اور سنہوری نے اپنی کتاب خلافت میں بات کی ہے، کہ کیسے ایک 'اسلامک لیگ آف نیشنز' کو ترقی دی جاسکتی ہے۔ موجودہ زمانے کے محققین بھی اس طرح کی ملتی جلتی فکر پیش کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وقت آچکا ہے کہ ہم اپنے محدود تصوراتی خول سے نکلیں اور عالمی تناظر میں اس معاملے کو دیکھیں۔ مسلمانوں کی آج کے عالمی منظرنامے میں کیا پوزیشن ہے یا کیا پوزیشن ہوسکتی ہے؟ اس پر غور کریں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہمیں ایک حکمت عملی پر مبنی فکر کی ضرورت ہے۔

اسلامی تحریکیں: نئی حکمت عملی کی ضرورت

دنیا بھر کی تحریکات اسلامیہ کو نئی سوچ بچار (thinking) کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں اسٹرے ٹیجک تعلیم کی نئی طرح ڈالنی ہوگی۔ ہم سب تحریک اسلامی سے وابستہ لوگ ہیں اور تحریک اسلامی کے تربیتی پروگراموں سے گزرے ہیں، لیکن افسوس اور حسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ مجھے ان سارے تربیتی مرحلوں میں کہیں اسٹرے ٹیجک تھنکنگ اور اسٹرے ٹیجک تعلیم کے بارے میں کوئی سنجیدہ پروگرام یاد نہیں آتا کہ ہوا ہو۔ میری پختہ رائے ہے کہ ہمیں اپنی نئی نسل کے لیے اسٹرے ٹیجک تھنکنگ کا نیا پراگرام متعارف کرانا چاہیے۔

دراصل اسٹرے ٹیجک تھنکنگ نہ ہوئی تو قربانی و ایثار کا سلسلہ تو بڑھتا چلا جائے گا، لیکن نتیجہ انتہائی محدود برآمد ہوگا۔ یہ اسٹرے ٹیجک سینس کی کمیابی کی علامت ہے۔ جب قربانیاں عظیم تر ہوں اور کامیابیاں انتہائی قلیل ہوں تو اس کا سیدھا مطلب اسٹرے ٹیجک تھنکنگ کا قحط ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے ہاں اسی کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں تزویراتی تعلیم (Strategic Education) کی راہ اپنانی چاہیے۔ چنانچہ اس قسم کی سوچ کی افزائش کے لیے ہمیں

تحریکِ اسلامی کی نئی نسل کے لیے نئے پروگرامات ترتیب دینا ہوں گے۔ تزویراتی سوچ کے بغیر قربانیوں کا سلسلہ جاری رہے گا اور یہ بات پھر دُہراؤں گا کہ ان قربانیوں کا ثمر بہت قلیل رہے گا۔ کسی مقصد کی راہ میں بڑی قیمت چکانے کے باوجود قابلِ ذکر نتائج کا حاصل نہ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ منصوبہ سازوں کے ہاں تزویراتی بصیرت اور فہم کا فقدان اور افلاس پایا جاتا ہے۔

اپنی یونی ورسٹی میں عسکری تاریخ کا مضمون پڑھاتا ہوں اور اس دوران میں میری کوشش ہوتی ہے کہ طلبہ کو اسٹرے ٹیجک سوچ پر کلاسیکل کتب سے متعارف کرواؤں۔ چنانچہ اس سلسلے میں طلبہ کا تعارف The Art of War کے عنوان سے چار مختلف ماہرینِ حرب کی لکھی کتابوں سے کرواتا ہوں۔ یہ چار ماہرینِ حرب: سن زو (Sun Tzu)، میکیاولی (Machiavelli)، کلاز وٹز (Clausewitz) اور جومینی (Jomini) ہیں۔ ان سب نے ایک ہی عنوان The Art of War پہ کتب تصنیف کی ہیں۔ یاد رہے کہ تزویراتی سوچ کا آغاز دراصل عسکری منصوبہ بندی کے تناظر میں ہی ہوا تھا۔

ہمیں اس تاریخی ذخیرے کی طرف لوٹنے اور اسے نئی نسل تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ ضروری ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارک اور اسلامی فتوحات کا احوال تزویراتی نقطۂ نظر سے پڑھیں۔ کچھ اہلِ علم نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے کیا بھی ہے، جیسے بریگیڈیئر محمود خطاب نے الرسول القائد کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اسی طرح ان کی ایک کتاب سفراء النبیؐ کے عنوان سے ہے۔ اپنے عسکری پس منظر کی وجہ سے مصنف نے سیرتِ نبویؐ کو کامیاب حربی اور تزویراتی منصوبہ بندی کے تناظر میں ہی دیکھا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کو محض معجزات کے ایک سلسلے کے طور پر ہی نہیں دیکھتے بلکہ آپؐ کی کامیاب حربی حکمتِ عملی اور کامیاب ترین جنگی چالوں (Tactics) کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ آج ہمارے مطالعۂ سیرت اور عمومی تعلیم میں یہ عنصر بڑی حد تک ناپید ہے۔ اپنی تعلیم میں موجود اس کمی کو دور کرنے کے لیے ہمیں بہت محنت کی ضرورت ہے۔

تزویراتی طرزِ فکر ایک خالص تخلیقی، حکیمانہ، ہمہ جہتی طرزِ فکر کا نام ہے۔ تخلیقی اس لیے کہ ہمیں مقصد کے حصول کے لیے درکار ذرائع کو بدلتے رہنا ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زندگی میں ہماری بہت سی ناکامیوں کا سبب عام طور پر ہماری سابقہ کامیابیاں ہوتی ہیں۔ ہم ایک مخصوص

صورت حال میں کامیابی کے لیے کچھ ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ پھر صورت حال میں تو تبدیلی واقع ہوجاتی ہے، لیکن ہمارے نقطۂ نظر اور اس کے لیے ہمارے اختیار کردہ ذرائع میں تبدیلی نہیں آئی ہوتی، یوں نتیجہ ناکامی کی صورت میں نکلتا ہے۔ بالکل اسی طرح آج کے دور میں بھی اسلامی تحریکات کے تنظیمی ڈھانچہ میں موجود بہت سی چیزوں میں تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ تنظیمی ڈھانچے میں، قیادت کی نوعیت اور اسلوب میں، حکمتِ عملی اور اس کے اسلوب میں، معاشرے کے ساتھ اپنے ربط وضبط اور تعامل کے طریقوں میں، دیگر سیاسی قوتوں کے ساتھ معاملات کرنے کے انداز میں، نظام عالم اور عالمی طاقتوں کو دیکھنے کے روایتی انداز میں، اور اپنی سرزمین پر ان کی موجودگی اور ان کے اثر ونفوذ کو پرکھنے کے انداز میں بہت سی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں تجزیہ کرنا ہے کہ ہم ان سب چیزوں کو کس زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں، اور پھر کئی حوالوں سے ان سب میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

ہمیں تبدیلی کی مختلف حکمتِ عملیوں کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ چونکہ تحریکِ اسلامی مثبت تبدیلی لانے والی قوت کا نام ہے، اس لیے ہمیں تبدیلی کی اسٹرے ٹیجی کو بھی سمجھنا چاہیے۔ تبدیلی خاموش انقلاب کی صورت میں بھی ہوسکتی ہے اور ایک پُرشور، ہنگامہ خیز انقلاب کی شکل میں بھی۔ یہ تبدیلی سیاسی قوتوں اور طاقت کے مراکز مثلاً فوج کے مزاج، اس کی گرفت اور کردار کو سمجھنے سے بھی ہوسکتی ہے، جیسا کہ بعض جنوبی امریکی ممالک میں ہوا۔ تبدیلی کئی طرح کی ہوتی ہے اور ہر تبدیلی کا سیاق وسباق بھی الگ ہی ہوتا ہے۔

امریکی مفکر جوزف نائے (Joseph Nye) جس نے 'سافٹ پاور' اور 'سمارٹ پاور' کی اصطلاحات متعارف کروائی ہیں، اس کی ایک اور اہم اصطلاح 'Contextual Intelligence' بھی ہے، جس کا مطلب ہے ایسی ذہانت کا حامل ہونا، جس کے بل پر ہر چیز کا سیاق وسباق اور موقع محل متعین کیا جاسکے۔ حقیقی قائدین، کامیاب سیاست دان اور کامیاب مصلحین وہی ہوتے ہیں، جو اپنی ذات اور اس کے تناظر کی درست تفہیم رکھتے ہیں۔ چنانچہ تحریکات اسلامیہ کو ایک ہی مقصد اور ایک ہی منزل ہونے کے باوجود ایک ہی انداز میں کام نہیں کرتے رہنا چاہیے۔ ہر ایک کا اپنا پس منظر اور ماحول (context) ہے، آج ہمیں کامیابی کے لیے کچھ اسی طرح کی Contextual Intelligence درکار ہے۔

سوال: کیا ہمیں اب محض بات برائے بات اور نرے اصولی مباحث کے بجائے عملی اقدامات کی جانب جانے کی حکمتِ عملی نہیں ترتیب دینی چاہیے؟

ڈاکٹر محمد مختار: میری رائے میں ہمیں گفت وشنید اور عملی اقدامات میں ہم آہنگی اور توازن لانے کی ضرورت ہے۔ نظریاتی مباحث اہم ہیں۔ نظریاتی رہنمائی کے بغیر ہم طویل المدت منصوبہ بندی سے محروم رہ کر ہر چیز کو محدود زاویے سے ہی دیکھ پاتے ہیں۔ اس لیے قلیل المدت ترجیح کے طور پر، سب سے پہلے ہمیں تزویراتی سوچ کا رویہ پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہمیں اپنے سابقہ تجربات کا ناقدانہ تجزیہ کرنے، ان کے نتائج وعواقب، فوائد ونقصانات پر غور کرنے اور خواہشات پر مبنی تجزیوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے تحریکِ اسلامی کے ماضی کے سفر کا بے لاگ جائزہ لینے اور تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

آپ جانتے ہوں گے کہ حکمت عملی کے ماہرین ایک اصطلاح استعمال کرتے ہیں 'Net assessment'۔ ہر اسٹرے ٹیجک غور وفکر کا آغاز Net assessment سے ہوتا ہے۔ تحریک اسلامی اور مسلم معاشروں کے تجربات میں مثبت اور طاقت ور پہلو کیا تھے اور ان کے کمزور پہلو کون کون سے ہیں؟ اس مقصد کے لیے ہمیں صرف اسلامی تحریک ہی کو مدنظر رکھ کر نہیں سوچنا چاہیے، نہ اسلامی تحریک کو کسی فرقے اور جماعت تک محدود رہنا چاہیے، بلکہ ہمیں پوری امت اور سارے مسلمانوں کو مدنظر رکھ کر اپنی سوچ اور حکمت عملی ترتیب دینے کی ضرورت ہے اور تجزیے کے بعد عملی سرگرمیوں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح مسلمان نوجوان کی تعلیم وتربیت میں جو عنصر غائب یا نظرانداز ہے وہ نظریاتی ہے۔ ہمیں اس کی فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال: ایک بہت بڑا خلا ہے، اس میں جو کچھ مسلم حکومتیں کر رہی ہیں، اور ان کے عوام کی اُمنگوں اور آرزوؤں کے درمیان ایک بہت بڑا خلا ہے؟

جواب: میرے نزدیک اس کا بنیادی سبب حکمرانوں کی قانونی حیثیت کا فقدان ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اگر حکمران کی قانونی حیثیت جائز (Legitimate) حکمران کی ہوجائے تو اس سے حاکم اور محکوم دونوں کے درمیان مکمل اتفاق اور ہم آہنگی وجود میں آجائے گی۔ ایسی حکومت کو ہیکل نے مکمل ہم آہنگ ریاست کا نام دیا ہے۔ مکمل ہم آہنگ ریاست میں حاکم اور محکوم کی خواہش

ایک ہی سمت میں ہوتی ہے۔ جہاں تک ہماری صورت حال ہے، مسلم دُنیا کے اندر سیاسی ہیئت حاکمہ یا مقتدرہ کے قانونی و دستوری جواز کے فقدان کی بنا پر عوام اور ہیئت مقتدرہ کی آرزوؤں اور اُمنگوں کے درمیان ایک کش مکش اور تصادم جاری رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری قوتیں اور صلاحیتیں کسی تعمیر و ترقی میں نہیں کھپتیں بلکہ باہمی کش مکش کی نذر ہوتی رہتی ہیں۔ مسلم معاشروں میں برپا اسی سیاسی کشاکش کی بنا پر ہی ہم کبھی ترقی نہیں کر پاتے اور پسماندگی ہی ہمارا مقدر رہتی ہے۔ اسی سوال کا جواب دینے کے لیے میں نے ایک کتاب تالیف کی ہے جس کا نام اسلامی تمدن میں دستوری بحران ہے۔ اس کتاب کی بنیادی فکر اور بنیادی فلسفہ یہی ہے کہ مقتدرہ کی قانونی حیثیت اور جواز کا مسئلہ، اسلامی تہذیب و تمدن کا دیرینہ مسئلہ ہے۔ معروف کتاب الملل والنحل کے مصنف امام شہرستانی، نویں صدی ہجری میں اس مسئلہ پر بات کرتے ہوئے کتاب کے آغاز میں ہی لکھتے ہیں: ''اُمت میں دَر آنے والا اوّلین اختلاف امامت و خلافت کے باب میں تھا۔ کسی دینی اصول اور قاعدے پر اتنی تلواریں نہیں چلیں جتنی ہر زمانے میں امامت و خلافت کے مسئلے پر چلیں''۔

مقتدرہ کا دستوری و قانونی اور شرعی جواز ہمارے معاشرے کا کمزور ترین پہلو ہے۔ اسی لیے ہر مسلمان قوم پر اس اہم اسٹرکچرل پرابلم کا حل نکالنا واجب ہے۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ ہمارے ملکوں میں جہاں جہاں فی الحقیقت جائز مقتدرہ ہوگی وہاں قومی اُمنگوں اور حکومتی کارگزاریوں میں تناقض جنم ہی نہیں لے گا۔ علّامہ اقبالؒ کا ایک قول ہے جس کا عربی ترجمہ مجھے یاد ہے:

ان السادۃ یدینون للعبید بسیادتہم فلو لم یقبلوھم سادۃ لما سادوا، یعنی سرداروں کی سرداری غلاموں کے مرہون منت ہے۔ اگر غلام انھیں سردار نہ تسلیم کرتے تو سردار، سردار نہ ہوتے۔

اس لیے جب تک مسلم دنیا اندرونی آقاؤں یعنی مطلق العنان آمریتوں سے چھٹکارا نہیں پائے گی، بیرونی غلامی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ہنری کسنجر کا عرب سیاست کے بارے میں ایک مشہور نظریہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''عرب دنیا میں جاؤ تو سمجھو کہ عوام کا کوئی وجود ہی نہیں ہے اور کوئی عوامی ادارہ نہیں ہے۔ اس لیے عرب دنیا کو ایک بدو قبیلے کے طور پر لو، اور سب سے بڑا خیمہ قبیلے کے سردار کا ہوگا، اسی کے ساتھ معاملات طے کرو۔ عوام کی کوئی فکر نہ کرو۔ سردار اپنے لوگوں کو خود

مطمئن کر لے گا‘‘۔ افسوس کہ اس مشاہدے میں مبالغہ نہیں ہے۔

مغربی حکمران اور دیگر استعماری طاقتیں جب تک مسلم عوام اور اداروں کو نظرانداز کر کے انفرادی طور پر آمر حکمرانوں سے معاملہ بندی اور سمجھوتہ کرتی رہیں گی، صورتِ حال میں کوئی تبدیل نہیں آئے گی۔ جارج بش، مصری ڈکٹیٹر حسنی مبارک کو فون کرتا ہے اور جو چاہتا ہے حاصل کر لیتا ہے، یا پاکستانی ڈکٹیٹر پرویز مشرف کو ایک فون کال کر کے اپنے من پسند نتائج حاصل کر لیتا ہے، اور فرانسیسی صدر الجزائر کے صدر کو فون کر کے جو بات چاہتا ہے منوا لیتا ہے، قطع نظر اس کے کہ پاکستانی، مصری یا الجزائری عوام کی خواہش کیا ہے۔ یہ ہے ہمارا سب سے بڑا چیلنج۔ یہ چیلنج ہمیں واپس جس جگہ پہنچا دیتا ہے وہ ہے ’قانونی و سیاسی قبولیت‘ (Political Legitimacy) کا بحران۔ ہر بحران یہیں سے جنم لیتا ہے اور اس کا اختتام بھی اسی نکتے پر ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے اپنے ممالک میں موجود اس اس بڑے ہی بنیادی سقم (structural problem) کو دُور کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر ہم آگے بڑھنے کے قابل کبھی نہیں ہو پائیں گے۔